تحریر : علامہ محمد اسد صاحب (حال مقیم مراکش)
ترجمہ : جناب محمد معین خان بی۔ اے (عثمانیہ)

مسلمان اور مسئلہ تعلیم

مغربی طرز تعلیم کے اثرات

مسلمان جب تک مغربی تہذیب پر اس اعتبار سے نظریں جمائے رہیں گے کہ گویا یہی وہ واحد قوت ہے جو ان کی اپنی جامد تہذیب کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑائیگی، اس وقت تک وہ اپنی خود اعتمادی کی بنیاد کو اپنے ہی ہاتھوں برباد کرتے رہیں گے اور بالواسطہ طور پر مغرب کے اس دعوٰی کی حمایت کرتے رہیں گے کہ اسلام ایک "درماندہ قوت" ہے۔

گذشتہ ابواب میں اس رائے کی تائید میں چند دلائل پیش کئے گئے ہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب چونکہ قطعی متضاد و متبائن تصوّرات حیات پر مبنی ہیں۔ اس لئے ان کے اندازِ فکر و نظر میں کوئی موافقت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مسلم نوجوانوں کو دی جانے والی مغربی طرز کی تعلیم جو بالکلیہ یورپی ثقافت کے اقدار و تجربات پر مبنی ہوتی ہے، اسلام دشمن موثرات سے پاک و مبرّا رہ سکے گی۔؟

اگر ہم ایسی توقع کریں بھی تو ہماری یہ توقع قطعاً حق بجانب نہیں ہو سکتی۔ ان مستثنیات کے قطع نظر جن میں ایک نہایت ہی غیر معمولی ذکی و طباع ذہن کسی تعلیم کے مضمرات سے مغلوب نہیں ہوتا، یہ امر یقینی ہے کہ مغربی طرزِ تعلیم حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کے ساتھ مسلم نوجوانوں کے

تعلق ایمانی کو مسمار کر دے گی، اور ان کے اس تصور کے پرخچے اڑا دے گی کہ وہ اسلام کی مخصوص دینی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ جن "دانشوروں" نے مغربی طرز پر تعلیم پائی ہے، ان کا رہا سہا مذہبی عقیدہ بھی روز بروز نسیاً منسیاً ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے ایک عملی مذہب کی حیثیت سے اپنی سالمیت کو غیر تعلیم یافتہ طبقات میں محفوظ و مامون کر لیا ہے۔ تاہم یہ بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ مغرب زدہ دانشوروں کے مقابلہ میں ان غیر تعلیم یافتوں کی طرف سے اسلام کی آواز پر لبیک کی صدائیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بلند ہوتی ہیں۔ دانشوروں کی اس مذہب دوری کی توجیہہ یہ نہیں ہے کہ مغربی سائنس نے جس کی ان لوگوں کو تعلیم دی گئی ہے، ہماری مذہبی تعلیمات کی سچائی کے خلاف کوئی معقول دلیل و برہان پیش کر دی ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جدید مغربی تہذیب کا ذہنی ماحول اس شدت کیساتھ مذہب دشمن واقع ہوا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نئی پود کی مذہبی توانائیوں پر خبیث جن کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

ایسا تو شاذ ہی ہوتا ہے کہ کفر و ایمان صرف دلیل و حجت کی بناء پر دلوں میں جاگزیں ہوتے ہوں۔ کبھی کبھی یہ وجدان یا مثلاً درک و بصیرت کے راستے دلوں میں اترتے ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں انہیں قلب انسانی میں منتقل کرنے والا ذریعہ خود انسان کا ثقافتی ماحول ہوتا ہے۔ ایک ایسے بچے کی مثال لیجئے جسے ابتدائی عمر ہی سے پکے راگ سننے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے کان نئے سُر اور آہنگ میں تیز کرنے کے عادی ہوتے چلے جاتے ہیں، اور بڑا ہو کر وہ اگر خود پکے راگ گانے کا اہل نہ بھی بنے تو کم از کم انتہائی دشوار قسم کی موسیقی کو سمجھنے کا اہل ضرور بن جاتا ہے۔ لیکن ایک ایسا بچہ جسے اپنی ابتدائی عمر میں موسیقی جیسی کوئی چیز سننے کا کبھی اتفاق ہی نہ ہوا ہو تو وہ بڑا ہو کر موسیقی کی مبادیات کی خوبیوں کو بھی سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ یہی حال مذہب کیساتھ ارتباط و تعلق کا بھی ہے۔ جسطرح فطرت بعض افراد کو موسیقی کے معاملہ میں گوش شوق کی نعمت سے یکسر محروم کر دیتی ہے، اسی طرح دنیا میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جن کے کان مذہب کی آواز کے معاملہ میں بالکل بہرے ہوتے ہیں۔ لیکن نوع بشر کی اکثریت کے حق میں کفر و ایمان کا فیصلہ وہ ماحول کرتا ہے جس میں اسے نشو و نما ملتی ہے۔ اسی لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔ (صحیح بخاری)

ہر بچہ پاکیزہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں

مندرجہ بالا حدیث میں "ماں باپ" کی جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اس کو منطقی اعتبار سے عام ماحول — خاندانی زندگی، سکول اور معاشرہ وغیرہ — پر بھی پھیلایا جا سکتا ہے جس سے بچہ کی ابتدائی نشوونما متعین و مشخص ہوتی ہے۔ اس بات سے تو قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ دورِ انحطاط میں کئی مسلم گھرانے ایسے ملیں گے جن کا مذہبی ماحول اس قدر پست اور ذہنی اعتبار سے اتنا زبوں ہوتا ہے کہ پروان چڑھتے ہوئے نوجوانوں کو یہ ماحول سب سے پہلے اپنے ہی مذہب سے روگرداں ہو جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ قرینہ تو یہی کہتا ہے کہ صورت ایسی ہی کچھ ہے۔ لیکن ان صورتوں میں جہاں مسلم نوجوانوں کو مغربی طرز پر تعلیم دی جا رہی ہو۔ اس کا نتیجہ یقیناً یہی برآمد ہوگا کہ یہ نوجوان آگے چل کر مذہب دشمن رویہ اختیار کر بیٹھیں گے۔

اب یہاں ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید آموزش کے بارہ میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے —؟

مسلمانوں کو مغربی تعلیم دینے کے خلاف احتجاج کرنے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہو سکتے کہ اسلام تعلیم ہی کا مخالف ہے۔ ہمارے مخالفوں نے اسلام پر جو اس قسم کا الزام تھوپا ہے اس کی نہ تو کوئی فقہی بنیاد ہے اور نہ تاریخی۔ قرآن مجید تو اس قسم کے بیانات سے بھرا پڑا ہے، "تاکہ تم سمجھدار بن جاؤ۔" "تاکہ تم سوچو"۔ "تاکہ تم جانو"۔ قرآنِ مجید کے شروع میں یہ ارشاد ملتا ہے۔

وعلم آدم الاسماء کلھا۔ (۲:۳۱) اور اس نے آدم کو سارے اسماء سکھا دئے۔

اور اس کے بعد کی آیات یہ بتلاتی ہیں کہ ان "اسماء" کے علم کی بدولت انسان کو ایک اعتبار سے فرشتوں پر بھی فضیلت حاصل ہو گئی۔ "اسماء" دراصل قوتِ توضیحِ اصطلاحات کے اشاراتی مظہر ہیں۔ فکرِ درّاک کی وہ قوت جو انسان کے لئے مختص ہے اور جو قرآنِ مجید کے ارشاد کے بموجب اس کو زمین پر خلیفۃ اللہ کے منصب کا اہل بناتی ہے، اپنی فکر سے ایک قاعدہ کے مطابق کام لینے کیلئے انسان پر لازم ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔ اور اسی لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سلک طریقاً یلتمس فیہ علماً سھل اللہ لہ بہ طریقاً الی الجنۃ

جو علم کی جستجو میں راستہ طے کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

(صحیح بخاری)

ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب

ایک عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ بدرِ کامل کو کواکب پر۔

(مسند ابن حنبل، جامع الترمذی، سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن الدارمی)

لیکن تحصیل علم کے بارہ میں اسلامی روّیہ کی مدافعت کے لئے قرآنی آیات یا احادیث نبویؐ کے حوالوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ خود تاریخ پورے وثوق کے ساتھ یہ ثابت کر رہی ہے کہ روئے زمین پر کسی مذہب نے اسلام کے برابر سائنسی ترقی کی تحریک وتشویق کا سامان مہیا نہیں کیا۔ بنو امیہ، بنو عباس اور ہسپانیہ کی اسلامی حکومت کے زمانوں میں جو نہایت شاندار ثقافتی کارنامے انجام پائے ہیں وہ اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہیں جو تحصیل علم اور سائنسی تحقیقات کو اسلامی فقہ سے ملی تھی۔ یورپ اس حقیقت سے یقیناً بخوبی آگاہ ہوگا، کیونکہ خود اسکی ثقافت پر اسلام کے جو احسانات ہیں وہ ان احسانات سے کسی طرح کم نہیں ہیں جو صدیوں کی جہالت کے بعد نشاۃ ثانیہ نے اس پر کئے ہیں۔ لیکن ذکرِ احسان سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم ایسے وقت ان عظیم الشان یادوں پر فخر کریں جبکہ دنیائے اسلام خود اپنی روایت فراموش کر چکی ہے اور بے بصری اور عقلی افلاس کے گڑھے میں جا گری ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ موجودہ مسکنت اور پستی میں اپنی عظمت ہائے رفتہ پر ڈینگیں ماریں۔ بلکہ ہم پر تو یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہم اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیں کہ یہ مسلمانوں کی غفلت شعاری تھی نہ کہ خود اسلامی تعلیمات کی کوئی خامی جس نے ہمیں تنزل وانحطاط کے اس درکِ اسفل میں دھکیل دیا۔

اسلام نے ترقیٔ سائنس کی راہ میں کبھی روڑے نہیں اٹکائے اسلام تو انسان کی ان تمام ذہنی سرگرمیوں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسے مرتبہ میں فرشتوں سے بھی بالا کر دیں۔ دنیا کے کسی مذہب نے شعور وعقل اور نتیجتاً تحصیل علم کو زندگی کے دیگر تمام مظاہر پر اس شد و مد کے ساتھ ترجیح نہیں دی۔ اگر ہم اسلام کے اصولوں کی پیروی کریں تو ہمارے دل میں جدید علوم کی تحصیل کو اپنی زندگی کے دائرہ سے خارج کر دینے کا قطعاً کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں بیشک علم حاصل کرنے اور ترقی کی منزل پر منزل مارنے اور معاشی اور سائنسی اعتبار سے مغربی اقوام کی طرح لائق و کارکرد بننے کی ضرور آرزو کرنی چاہئے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی خوب ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ہم مغرب کی آنکھ سے دیکھنے اور مغرب کے دماغ سے سوچنے کی آرزو ہرگز نہ کریں۔ اگر ہم دنیا میں مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اسلام کی روحانی ثقافت کو مغرب کے مادہ پرستانہ تجربات سے بدلنے کی قطعاً آرزو نہ کریں۔

علم فی نفسہ نہ تو مغربی ہے اور نہ مشرقی۔ یہ ایسا ہی آفاقی ہے جیسے حقائقِ فطرت — لیکن زاویۂ نظر جس سے حقائق دیکھے اور پیش کئے جاتے ہیں، قوموں کے ثقافتی مزاج کے بموجب

بدلتا رہتا ہے۔ اس حیثیت سے علم حیوانات ہو کہ علم نباتات یا علم طبعیات، اپنی اصل و غایت کے اعتبار سے نہ تو مادہ پرستانہ ہیں اور نہ روحانی۔ ان علوم کا تعلق تو حقائق کے مشاہدہ اجماع اور تعریف اور ان حقائق سے عام ضابطوں کے استنباط سے ہے۔ لیکن ان سے ـــــ یعنی فلسفہ و سائنس سے ـــــ ہم جو استقرائی فلسفیانہ نتائج استنباط کرتے ہیں وہ محض حقائق و مشاہدات پر مبنی نہیں ہوا کرتے بلکہ وہ بہت بڑی حد تک زندگی اور اس کے مسائل کے بارہ میں ہمارے مزاجی یا وجدانی رویہ سے بھی اثر پذیر ہوا کرتے ہیں۔ جرمنی کے عظیم فلسفی کانٹ کا قول ہے کہ "ہماری عقل اپنے نتائج فطرت سے اخذ نہیں کرتی بلکہ انہیں فطرت کے لئے تشخیص کرتی ہے۔ یہ بات بظاہر ایک عجوبہ سی لگتی ہے، لیکن واقعتاً ہوتا ایسا ہی ہے۔" مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے۔ وہ صرف ایجابی زاویۂ نگاہ ہے کیونکہ ہم معروض کی جو تشریح کرتے ہیں اس کو ہمارا زاویۂ نگاہ سرتاسر بدل سکتا ہے۔

اسطرح سائنس جو فی نفسہ نہ تو مادہ پرستانہ ہے اور نہ روحانی، ہمیں کائنات کی بے انتہا انتشار پذیر تشریحات کی ڈگر پر ڈال دیتی ہے ـــــ یعنی ایسی تشریحات جو ہمارے رجحان کے بموجب روحانی بھی ہو سکتی ہیں اور مادہ پرستانہ بھی۔ مغرب اپنی بے انتہا نتھری ہوئی عقلیت پسندی کے باوصف مادہ پرستانہ رجحان کا حامل ہے اس لئے وہ اپنے تصورات اور بنیادی مفروضات کے اعتبار سے مذہب دشمن ہے۔ بریں بناء مغربی نظام تعلیم کا بھی بالجملہ مذہب دشمن ہونا ایک امر لازمی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کی ثقافتی صداقت کے لئے جو چیز مضرت رساں ہے وہ جدید تجربی علوم کا مطالعہ نہیں بلکہ مغربی تہذیب کی روح ہے جس کے وسیلہ سے مسلمان ان علوم تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

یہ ہماری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم خود اپنی ہی بے التفاتی اور غفلت شعاری کے ہاتھوں سائنسی تحقیقات کے معاملہ میں علم کے مغربی ماخذوں کے محتاج بن گئے ہیں۔ اگر ہم نے اسلام کے اصول کی ہمیشہ پیروی کی ہوتی جسکی رو سے ہر مسلمان پر تحصیل علم کا فریضہ عائد ہوتا ہے تو ہم جدید علوم کیلئے آج مغرب کی طرف یوں نظریں اٹھا اٹھا کر نہ دیکھتے جیسے ریگستان میں شدت تشنگی سے جاں بلب آدمی افق پر سراب کی جانب دیکھتا ہے۔ مسلمان چونکہ ایک عرصۂ دراز سے خود اپنے ممکنات سے غفلت برتتے رہے۔ اس لئے وہ جہالت و افلاس میں جا گرے۔ درآنحالیکہ

یورپ جرأت مندی سے آگے ہی آگے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ اس فرق و اختلاف کی خلیج کو پاٹنے کیلئے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ اس وقت تک ہمیں جدید علوم کو مجبوراً مغربی طریق تعلیم کی وساطت سے قبول کرنا ہوگا۔

اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ ہم صرف سائنسی مواد و منہاج (SCIENTIFIC MATTER AND METHOD) اخذ و قبول کریں گے اور اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔ دوسرے الفاظ میں مغربی علوم قطعیہ کا مطالعہ کرنے سے ہم بالکل ہی نہ ہچکچائیں۔ البتہ مسلم نوجوانوں کی تعلیم میں مغربی فلسفہ کے کسی بھی جزو کو ہرگز ہرگز راہ پانے نہ دیں۔ سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس وقت بہت سے علوم قطعیہ مثلاً جوہری طبعیات خالص تجربی تحقیق و تفحص کی سرحدوں کو عبور کر کے فلسفہ کے میدانوں میں داخل ہو چکے ہیں لہذا کئی صورتیں ایسی ہیں جن میں تجربی سائنس اور قیاسی فلسفہ کے مابین خط امتیاز کا کھینچنا انتہائی دشوار ہے۔ یہ ایک طرف تو بالکل صحیح ہے، لیکن دوسری طرف ٹھیک یہی وہ مقام ہے جہاں ثقافت اسلامیہ کو اپنا وجود از سر نو منوانا ہوگا۔ یہ مسلم سائنسدانوں کا فرض ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ سائنسی تفحص کے آخری کنارہ پر پہنچ جائیں تو اس وقت مغرب کے فلسفیانہ نظریات سے دامن جھاڑ کر خود اپنے ہی قیاسی استدلال کی قوتوں کو منطبق کرنا شروع کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ خود اپنے ہی یعنی اسلامی نظر فکر سے ایسے ایسے نتائج استنباط کر جائیں جو مغربی سائنسدانوں کی اکثریت کے استنباط کردہ نتیجوں سے بالکل مختلف ہوں۔

مستقبل میں خواہ کچھ ہی پیش آئے، مغرب کے ذہنی رویہ کے آگے غلامانہ سر تسلیم خم کئے بغیر سائنس کا سیکھنا اور سکھانا آج بھی ممکن ہے۔ آج دنیائے اسلام کو جس چیز کی فوری اور اشد ضرورت ہے، وہ کسی نئے فلسفیانہ نظریہ کی نہیں بلکہ صرف جدید سائنسی اور فنی ساز و سامان کی ہے۔

اگر ہمیں ایک ایسی مثالی مجلس تعلیم کے آگے جو صرف اسلامی ملحوظات کے تابع ہوتی، اپنی تجاویز پیش کرنے ہوتے تو ہم اس امر پر بہت زور دیتے کہ مسلم اسکولوں میں مغرب کی تمام ذہنی تحصیلات کے منجملہ صرف علوم فطرت اور ریاضی کی تعلیم دی جائے اور ان اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں آج جو برتری یورپی فلسفہ، ادب اور تاریخ کی تدریس کو حاصل ہے وہ یک قلم موقوف کر دی جائے۔ ہماری اس تجویز سے یورپی فلسفہ کے بارہ میں ہمارے رویہ کی پوری پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ رہا یورپی ادب، اس کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے ــــ

لیکن اتنی بات ضرور ہونی چاہیئے کہ اس ادب کو اس کے اپنے صحیح فلسفیانہ موقف کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اس وقت مسلم ممالک میں جس انداز سے یہ ادب پڑھایا جا رہا ہے، وہ تعصب و جانبداری سے مبرا نہیں ہے۔ یورپی ادب کے اقدار کے بارہ میں جو بے پناہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مبالغہ خام و ناپختہ ذہنوں کو مغربی تہذیب کی روح کو، قبل اس کے کہ وہ اس روح کے سلبی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کے اہل بن سکیں پورے طور پر اخذ و قبول کرنے پر مائل کر لیتا ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب کے ساتھ نہ صرف ایک افلاطونی محبت کا میدان ہی تیار ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس تہذیب کی عملی تقلید ——— جو روح اسلام کے منافی ہے ——— کے لئے راہیں بھی ہموار ہو جاتی ہیں۔ اسلامی ثقافت کے تعمق و ثروت کو طلباء کے ذہن نشین کرانے اور اس کے مستقبل کے بارہ میں طلبار کے دلوں میں امید کی ایک نئی جوت جگانے کی غرض سے یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلم اسکولوں میں جو حیثیت اس وقت یورپی ادب کو حاصل ہے، وہ ایک معقول اور متمیز اسلامی ادب کے حوالہ کر دیا جائے۔

اگر یورپی ادب کی تعلیم جس صورت میں کہ وہ آج متعدد مسلم اداروں میں مروج ہے، مسلم نوجوانوں کو اسلام سے توڑ لیتی ہے، تو یہی بات اس سے بھی کہیں زیادہ تاریخ عالم کی یورپی تشریح پر بھی صادق آتی ہے۔ اس تشریح میں "رومی بمقابلہ وحشی" کا قدیم انداز خود یورپ ہی کا انداز ہو گیا ہے۔ اہل یورپ کی طرف سے تاریخ کی پیش کشی کا مقصد (مقصد کو تسلیم کئے بغیر) یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یورپی اقوام اور ان کی تہذیب ہر اس چیز سے ارفع و اعلیٰ ہیں جو اس دنیا میں پیدا کی گئی ہے یا پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سے مابقی دنیا میں اہل یورپ کی جستجوئے اقتدار کو ایک طرح کا اخلاقی جواز مل جاتا ہے۔ اہل روما کے زمانہ سے یورپی اقوام مشرق و مغرب کے باہمی اختلافات کو ایک مفروضہ یورپی "معیار" کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی چلی آ رہی ہیں۔ ان کا استدلال اس مفروضہ پر عمل کئے جاتا ہے کہ نوع بشر کی نشو و فروغ کا اندازہ صرف یورپ کے ثقافتی تجربات کی بنیاد ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تنگ زاویۂ نظر سے جو بھی تناظر پیدا ہوگا، وہ لازماً ٹیڑھا میڑھا اور اصلیت سے بعید ہوگا۔ یورپی نقطۂ نظر کی مروجہ اساس سے خطوط مشاہدہ جتنی دور پیچھے کی طرف ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ اہل یورپ کے لئے تاریخی معروضات کو ان کے اصلی رنگ و روپ میں استدراک کرنا اتنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔

اہل یورپ کے اس انا۔ مرکزی (EGO-CENTRIC) رویہ کے باعث ان کی توصیفی تاریخ عالم (DESCRIPTIVE HISTORY OF THE WORLD) حال حال تک فی الحقیقت مغرب کی مطول تاریخ (ENLARGED HISTORY OF THE WEST) کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس تاریخ میں غیر یورپی قوموں کا تذکرہ صرف اس حد تک روا رکھا جاتا تھا، جس حد تک ان قوموں کے وجود و فروغ یورپ کے مقدرات پر براہِ راست اثر انداز ہوتے تھے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ آپ یورپی اقوام کی تاریخ کا نقشہ شرح و بسط کے ساتھ اور صاف و واضح رنگوں میں کچھ اس انداز سے کھینچیں کہ ماسبقی اقطاعِ عالم کی صرف دو چار جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کر جائیں۔ اس تاریخ کو پڑھ کر بے چارہ قاری اس التباس میں مبتلا ہو جائے گا کہ سماجی اور ذہنی اعتبار سے یورپ کے کارناموں کی عظمت اتنی بلند ہے کہ باقی دنیا کے کارناموں کو ان سے کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اس سے قریب قریب یہ بھی ظاہر ہونے لگے گا کہ دنیا کی تخلیق گویا محض یورپ اور اس کی تہذیب ہی کی خاطر عمل میں لائی گئی ہے۔ اور دیگر تمام اقوام اور تہذیبوں کی تخلیق کی غرض و غایت ہی یہی تھی کہ وہ عظمت یورپ کے لئے ایک مناسب ماحول پیدا کریں۔ غیر یورپی نوجوانوں کے ذہنوں پر اس قبیل کی تواریخی تربیت کا صرف یہی اثر پڑ سکتا ہے کہ وہ خود اپنی ہی ثقافت، اپنے ہی تاریخی ماضی اور اپنے ہی مستقبل کے ممکنات کے بارہ میں ایک احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان نوجوانوں کو اپنے ہی مستقبل سے حقارت کرنے کی باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔

ان مذموم و مہلک اثرات کے سدِباب کے لئے فکر اسلامی کے رہنماؤں کو چاہئے کہ وہ مسلم اداروں میں تاریخ کی تعلیم و تربیت کے طریق و اسلوب کو از سرِ نو ترتیب دینے کی امکان بھر کوشش کریں۔ بلاشبہ یہ ایک مشکل کام ہے جو اس امر کا متقاضی ہے کہ مسلم نقطۂ نگاہ کے بموجب ایک جدید تاریخ مدوّن ہونے سے پہلے ہی ہمارے پورے نظام تدریس تاریخ کے ایک ایک کل پُرزے کی خوب جانچ پڑتال کر لی جائے۔ لیکن کام اگر مشکل ہے تو وہ ممکن بھی ہے اور نہایت اہم اور ناگزیر بھی۔ ورنہ نفرتِ اسلام کی زہریلی لہروں سے ہماری نئی پود کے ذہنوں کی آبیاری کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہمارے نوجوانوں کا احساس کمتری زیادہ سے زیادہ شدید ہوتا چلا جائے گا۔ بلاشبہ اس احساس کمتری کو اس طرح بھی قابو میں لایا جا سکتا ہے کہ مسلمان مغربی ثقافت کو بہ تمام و کمال اخذ و جذب کر لیں اور اپنی زندگی کی حدود سے

اسلام کو نکال باہر کرنے پر آمادہ و تیار ہو جائیں۔ لیکن کیا مسلمان ایسا کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔؟

ہمارا یہ ایقان ہے اور مغرب کے حالیہ واقعات ہمارے اس ایقان کی توثیق کرتے ہیں کہ اسلام کی اخلاقیات، اس کے سماجی اور شخصی اخلاق معدلت و حریت کے تصورات مغربی تہذیب کے متقابل تصورات و خیالات کی بہ نسبت بے انتہا اعلیٰ اور اکمل ہیں۔ اسلام نے نسلی نفرت کا قلع قمع کر دیا۔ اور انسانی اخوت و مساوات کی راہیں کھول دیں۔ لیکن مغربی تہذیب ہنوز اس قابل نہیں ہے کہ نسلی اور قومی عداوتوں کے تنگ و تاریک افق کے پار دیکھ سکے اسلام کے معاشرہ کے اندر آج تک طبقات اور طبقاتی جنگ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوا۔ لیکن اس کے برخلاف یونان و روما سے لیکر ہمارے زمانہ تک کی ساری یورپی تاریخ طبقاتی کشمکش اور سماجی نفرت سے بھری پڑی ہے۔ اس امر کا بار بار اعادہ ہونا چاہیئے اور پورے شد و مد کے ساتھ ہونا چاہیئے کہ صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جو مسلمان مغرب سے سود مندانہ طریقہ سے سیکھ سکتے ہیں، اور وہ ہے علوم قطعیہ اپنی خالص اور اطلاقی صورت میں۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ باہر سے حصول علم کی یہ ضرورت کسی مسلمان کو ہرگز یہ ترغیب نہ دینے پائے کہ وہ مغربی تہذیب کو اپنی تہذیب کے مقابلہ میں برتر و فائق سمجھے ——— ورنہ ایسا مسلمان اسلام کے مقصد و منہاج سے قطعاً بے بہرہ ہوگا۔ کسی ثقافت یا تہذیب کو دوسری ثقافت یا تہذیب پر جو فوقیت حاصل ہوتی ہے وہ مادی علوم کے وسیع تر ذخیرہ کی ملکیت پر مشمول نہیں ہوتی بلکہ وہ مشمول ہوتی ہے اس تہذیب یا ثقافت کی اخلاقی توانائی پر، حیات انسانی کے تمام پہلوؤں کی تشریح و تربیط کے وسیع تر امکان پر۔ اور اس باب میں اسلام کو دیگر تمام ثقافتوں پر فوقیت حاصل ہے ضرورت تو صرف احکام اسلام کے اتباع کی ہے تاکہ اس کی بدولت ہم وہ سب کچھ حاصل کر سکیں جس کا حاصل کرنا نوع بشر کے امکان و استعداد میں ہے۔ لیکن اگر ہم سچے دل سے اسلامی اقدار کو محفوظ رکھنا اور ان کو حیات نو بخشنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ مغربی تہذیب کی تقلید کا سودائے خام یکسر اپنے دماغ سے نکال دیں، کیونکہ مغربی تہذیب کے ذہنی اثر سے جدید اسلام کو جو نقصان پہنچے گا، وہ اس تہذیب کی تقلید سے حاصل ہونے والے نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بھاری ہوگا۔

سائنسی تحقیقات کے معاملہ میں جو غفلت مسلمانوں سے ماضی میں سرزد ہوئی ہے اسکی تلافی مغربی علوم کی بے قید و بند قبولیت سے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ہماری تمام تر سائنسی

(باقی صـ ۴۹ پر)